طاقت کے توازن کا قرآنی اصول
(سورہ انفال کی روایات کی روشنی میں)
(۲)

ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی

تحلیل وتجزیہ

گذشتہ اوراق میں اہم ترین مفسرین کرام کی آراء وتشریحات اور تفسیری روایات کا ایک نمائندہ بیان پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام مفسرین اور ان کی ساری تفسیرات کا پیش کرنا ممکن ہے نہ مفید۔ کیونکہ وہ سب ان ہی نمائندہ مفسرین اور تاویلات میں سے کسی نہ کسی کے طبقہ وخانہ میں آتی ہیں۔ مزید برآں متعدد دوسرے مفسرین و شارحین کا حوالہ متن میں بھی آیا ہے اور حواشی میں بھی۔ اب اصل کام یہ ہے کہ تمام مذکورہ بالا تفسیری روایات وتشریحات کا تجزیہ وتحلیل کیا جائے کیونکہ اصل مقصود تو یہ ہے کہ آیاتِ کریمۂ مذکورہ کے صحیح معنی ومفہوم کی تعیین ہو سکے اور ہمارا مقصود کہ کہ مسلم غلبہ کا اصلی معیار کیا ہے واضح اور طے ہو سکے۔ ہمارا تجزیہ وتبصرہ چند عناوین کے تحت پیش ہوگا۔

شانِ نزول

سب سے پہلا مسئلہ طے کرنے کا یہ ہے کہ یہ دونوں آیاتِ انفال کب نازل ہوئیں؟ تفسیرِ ماثور کے حاملینِ عالی مقام اور تفسیر رائے جائز کے قائلین کرام جیسے طبری وزمخشری بقاعی وغیرہ متقدمین میں اور مولانا تھانوی، مفتی محمد شفیع، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا امین احسن اصلاحی۔ متاخرین میں بالخصوص اس کے قائل ہیں کہ آیت کریمہ ۶۵ جنگِ بدر ۲ھ کے بعد نازل ہوئی اور آیتِ کریمہ ۶۶ اس کے ایک طویل عرصے

(مدۃ طویلۃ) کے بعد نازل ہوئی۔ اگرچہ ان میں سے بعض نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ پوری سورت ایک ہی مرتبہ پوری کی پوری ایک ساتھ نازل ہوئی تھی۔ مولانا مودودی جیسے بعض مفسرین نے اصولاً تو انفال کو ایک ہی بار میں نازل ہونے والی سورہ مانا ہے اور اسے ایک ہی مربوط تقریر بتایا ہے تاہم اس امکان کے بھی قائل ہیں کہ ہوسکتا ہے بعض آیات بعد میں کسی وقت نازل ہوئی ہوں اور مناسبتِ موضوع و مواد کے سبب اپنی ہم معنی و ہم مفہوم آیات کے پہلو میں رکھ دی گئی ہوں۔

جہاں تک دوسرے مکتبِ فکر کے مفسرین کرام کا تعلق ہے وہ بظاہر پوری سورتِ مقدسہ کی بیک وقت کلی تنزیل کے قائل نظر آتے ہیں۔ کم ازکم وہ زیرِ مطالعہ آیاتِ کریمہ کے حوالہ سے اس کے قائل ہیں کہ یہ دونوں آیات ایک ہی ساتھ نازل ہوئی تھیں۔ بیشتر کے ہاں یہ بات مضمر طور سے ملتی ہے اور بعض کے ہاں صراحت کے ساتھ نہ سہی مگر ان کی بحث کا محور تو یہی بتاتا اور ظاہر کرتا ہے۔ مولانا عبدالحق حقانی (۔۔۔ء) لکھتے ہیں کہ "یہ سورۂ ایام جنگ بدر میں مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ حسن اور عکرمہ و جابر بن زید و عطا وغیرہم ائمہ تفسیر سے منقول ہے۔ ابوالشیخ و ابن مردویہ و نحاس نے ابن عباس سے ایسا ہی نقل کیا ہے اور اس کو سورۂ بدر بھی کہتے ہیں[1]..."

جو مفسرین کرام اس بات کے قائل ہیں کہ آیتِ تخفیف۔ آیت ۶۶۔ ایک طویل مدت کے بعد نازل ہوئی ان کے خیال کی دو بنیادیں ہیں: اول حضرت ابن عباس کی ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ آیتِ تخفیف ایک طویل مدت کے بعد نازل ہوئی (پہلی آیتِ کریمہ کے بعد) دوسری یہ کہ جب وہ نسخ کے قائل ہیں تو ان کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ان دونوں آیتوں کے وقتِ نزول میں فرق کریں اور ایک کے نزول کو مقدم اور دوسرے کو مؤخر مانیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ واقعی صورتِ حال کیا ہے؟ آیا یہ دونوں آیاتِ کریمہ ساتھ ساتھ نازل ہوئی تھیں یا پچھلی آیت کے بعد میں آئی تھی؟ ماہرینِ علمِ شانِ نزول اور متبحرینِ اسبابِ تنزیل کا واضح نظریہ اور صریح موقف یہی ہے کہ پوری سورۂ انفال

---

[1] تفسیر حقانی / تفسیر فتح المنان، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دوم ص ۱۲۵۳

بیک وقت نازل ہوئی تھی اور اس کا وقت نزول غزوۂ بدر کا متصل زمانہ یعنی سنہ ۲ھ ہے۔ انھوں نے اس صورت میں کوئی آیت نہ تو متاخر مانی ہے اور نہ مکی۔ لہٰذا وہ ایک وقت کی سورہ ہے۔[1]

شاہ عبدالقادر دہلوی فرماتے ہیں: "سورۂ انفال اتری بعد جنگ بدر کے، جب ہجرت کے بعد حکم ہوا جہاد کا"، یہی بات مولانا شبیر احمد عثمانی نے کہی ہے۔ "یہ سورت مدنی ہے۔ جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی"، لیکن انھوں نے اور ان کے بعض دوسرے ہمنوا مفسرین نے۔ آیات کریمہ ۶۵ اور ۶۶ کے حوالہ سے موخرالذکر کے متاخر نزول کا خیال اپنا لیا کہ اس کے بغیر ان کا نظریۂ نسخ ثابت نہیں ہوتا۔

بہر حال یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سورت انفال پوری کی پوری مع آیات کریمہ ۶۵/۶۶ ایک ہی وقت میں نازل ہوئی تھیں اور ان کے مقدم و موخر نازل ہونے کا خیال صحیح نہیں ہے۔ خود ایسے مفسرین کرام کے بیانات میں تضاد پایا جاتا ہے اور شان نزول کے معاملہ میں الجھن بھی۔ حضرت ابن عباس کی روایت شانِ نزول ان کے قیاس و تخمین پر مبنی ہے اور بخاری کی روایت کردہ حدیث ابن عباس میں شاق ہونے کی بات سے جو وقتِ نزول نکالا گیا ہے وہ ان کے استنباط پر مبنی ہے۔ جن مفسرین کرام نے 'الآن' کے لفظ کو قرینہ بنایا ہے کہ اس سے آیت تخفیف کا نزول متاخر معلوم ہوتا ہے وہ بھی قیاسی ہے اور صحیح نہیں ہے کیونکہ تخفیف سے "الئن" کا تعلق ہے نہ کہ وقتِ نزول سے۔ یہاں لفظ 'الئن' دراصل غزوۂ بدر میں مسلم ضعف کی موجودگی اور ثبوت و مظاہرہ سے متعلق ہے اور پوری آیتِ تخفیف غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی جنگی حالت سے متعلق و مربوط ہے پھر قرآنِ مجید اور کلامِ عرب میں "الآن" بہت سی ایسی جگہوں پر استعمال ہوا ہے جہاں بات کے موخر ہونے کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ اسی طرح شاق ہونے کی بات سے یا تخفیف کی آیت سے آیتِ کریمہ ۶۶ کے موخر نزول کا خیال ثابت نہیں ہوتا کیونکہ امام بخاری نے ان آیات کریمہ کے تعلق سے دو روایات ابن عباس

---

[1] ۱۔ اتقان سیوطی، نوع ۱ و ۹، برہان زرکشی نوع ۱ و ۱

دو سندوں سے نقل کی ہیں۔

مباحثِ تفسیر واقوالِ مفسرین

متعدد علمائے لغت اور ماہرینِ تفسیر نے آیاتِ کریمہ کے معنی ومفہوم طے کرنے میں بحث کا آغاز اس نکتہ سے کیا ہے کہ آیات کے الفاظ اگرچہ خبریہ ہیں تاہم ان کے معانی انشائیہ ہیں۔ بعض نے اس کی تشریح وتعبیر میں یہ کہا ہے کہ بات تو وعدہ وبشارت کے سیاق میں کہی گئی ہے مگر وہ ہے دراصل حکم وامر کے مفہوم میں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں آیات میں پہلے یہ حکم دیا کہ دہ چند دشمن سے مقابلہ کریں، یا کم ازکم ان کے سامنے سے فرار نہ ہوں اور بعد میں تخفیف کے بعد حکم تو وہی برقرار رہا مگر دشمن سے مقابلہ یا ان کے سامنے سے عدم فرار میں عددی تناسب دشمن کا دہ چند کے بجائے دوچند کر دیا گیا کہ مسلمانوں میں ابھی ضعف یا کمزوری تھی۔

مقابلہ کا حکم یا فرار سے گریز کا امر: روایت حضرت ابن عباسؓ

قرآنی الفاظ وکلمات سے تو حکم کا مفہوم نہیں نکلتا کہ دونوں آیاتِ کریمہ کے عددی تناسب والے جملے اِن شرطیہ سے شروع ہوتے ہیں اور ان کا مفہوم شرط ومشروط کے نتیجہ پر مبنی ومنحصر ہے۔ لہٰذا امر وحکم کا مفہوم کہاں سے نکالا گیا؟ اس کی بنیادی وجہ تو حضرت ابن عباس کی وہ روایت ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ان آیاتِ کریمہ کے نزول کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کر دیا (کتب/فرض) کہ وہ دہ چند یا دوچند دشمن سے مقابلہ کریں یا کم ازکم فرار نہ ہوں۔ لیکن یہ بنیاد قرآنی الفاظ وکلمات کے خلاف بلکہ متصادم ہونے کے علاوہ محض قیاسِ راوی پر مبنی ہے۔ حضرت ابن عباس کی روایت بخاری کے الفاظ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ روایت عنعنہ ہے اور دوسرے راوی حضرت سفیان نے باصرار کہا کہ بیسؔ سوؔ سے نہ بھاگیں۔ پہلی روایت میں سفیان کے اضافے وتبصرہ کا زیادہ ذکر ہے بہ نسبت حضرت ابن عباس کے قول وتشریح کے۔ دوسری روایت حضرت عکرمہ کی سند پر ہے جس میں شاق ہونے کی اور دس کے مقابلہ میں ایک کے فرار نہ ہونے کی بات کہی گئی ہے اور وہ بھی روایت

عنعنہ ہے۔ پھر راوی کا اس میں بھی یہ اضافہ ہے کہ تعداد کی تخفیف کے بقدر صبر میں تخفیف کردی گئی۔ یہ اضافہ قابل قبول نہیں ہوسکتا کہ اول تو وہ صحابی جلیل کی رائے نہیں، دوم صبر کی تخفیف کی بنیاد قرآن کریم میں موجود نہیں بلکہ ضعف کی موجودگی کے سبب عددی تناسب کی تخفیف عمل میں آئی ہے۔ لہٰذا اگر ضعف موجود نہ ہو تو صبر کامل ہوگا اور عددی تناسب بھی اسی کے بقدر رہوگا اور غلبہ بھی اسی مناسبت سے ہوگا۔ شارحین بخاری حافظ ابن حجر اور علامہ انور شاہ کشمیری نے ان روایات پر بحث کی ہے اور اس کا کچھ حصہ علامہ رشید رضا مصری کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ پھر حضرت ابن عباس کی مذکورہ بالا روایات بخاری کے علاوہ حافظ ابن کثیر کی روایاتِ ابن عمرؓ بھی پیش نظر رہنی چاہییے جو اول الذکر کا صحیح مفہوم بتاتی ہیں۔

مسلم قلت وکثرت کا فرق اور نسخ

جہاں قدیم مفسرین کرام نے زیادہ تر حضرت ابن عباس کی روایات کی بنا پر تخفیفِ تناسب کی وجہ حکم اول کی تثقیل، گراں باری اور مشقت سمجھی اور سمجھائی ہے وہاں ہمیشہ جدید مفسرین کرام نے ان دونوں آیاتِ کریمہ کے حوالہ سے مسلم عددی قلت وکثرت پر زیادہ زور دیا ہے اور وہ بھی بعض قدیم مفسرین کرام کی پیروی میں۔ اس کا سلسلہ بھی امام طبری سے جا ملتا ہے۔ انھوں نے حضرت ابن عباس کا ایک مزید قول نقل کیا ہے کہ مسلمان جب کم تھے تو ایک دس کا تناسب تھا اور جب ان کی تعداد زیادہ ہوگئی تو تخفیف کے بعد تناسب ایک دو کا کر دیا گیا۔ بہت سے مفسرین نے اس توجیہ کو بلا نقد قبول کرلیا۔ ان کے اسمائے گرامی طبری نے بھی گنائے ہیں اور دوسرے مفسرین کی تشریحات میں بھی ملتے ہیں۔ اسی قلت وکثرتِ مسلمین کے حوالے سے بعض مفسرین عظام نے دہ چند تناسب کا تعلق غزوۂ بدر یا اس سے قبل کے غزوات وسرایا سے جوڑ دیا ہے اور دو چند کی نسبت کو ناسخ اول مان کر بعد کے غزوات وسرایا سے متعلق ہی نہیں کیا بلکہ بطور اصول قائم کر دیا کہ اب یہی نسبت قائم وجاری ہے۔ اور اول منسوخ ہے۔

علامہ زمخشری وغیرہ نے اپنے موقف کی تائید میں سریۂ حمزہ سے تاریخی استناد پیش کیا ہے کہ حضرت موصوف کے تیس نفری سریہ نے ابوجہل مخزومی کے دہ چند تین سو

نفری لشکر کا مقابلہ کیا تھا۔ امام رازی نے مکتب اول کے بعض مفسروں کا یہ تاریخی استناد پیش کیا ہے مگر خود اس کو قبول نہیں کیا۔ مولانا تھانوی نے قلت میں جوشِ عمل کی زیادتی اور کثرت میں اس کی کمی کا فلسفیانہ اور نفسیاتی اصول پیش کیا ہے جو بعض قدیم مفسرین کے خیال و نظریہ کا عکس ہے اور ان کے مریدوں، مسترشدوں اور پیرووں مفتی محمد شفیع، مولانا دریابادی، مولانا عثمانی اور مولانا اصلاحی وغیرہ نے اس کو اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔

نظریۂ قلت و کثرت کا تجزیہ و تغلیط

اس نظریہ و موقف کی تردید میں کئی طرح کے دلائل اور مختلف النوع شواہد موجود ہیں۔ اول بقول امام اصفہانی / رازی وغیرہ اس امر کا کوئی ثبوت ہے اور نہ روایت کہ دہ چند تناسب غزوۂ بدر یا اس سے قبل کے غزوات وسرایا کے لیے تھا۔ امام ابن العربی اور بعض دوسرے عظیم مفسرین نے اس کی واضح تغلیط کی ہے کہ جن لوگوں نے آیتِ اولی کے حکم کو غزوۂ بدر سے متعلق مانا ہے وہ ان کی واضح خطا ہے۔ لہٰذا پہلے غزوات وسرایا سے اس کو متعلق کرنا اور بھی غلط ہے۔ امام قرطبی نے بھی امام ابن العربی کے اس خیال سے اتفاق کیا ہے اور بعد کے دوسرے مفسرین کرام نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ دوم حافظ ابن کثیر کی روایت حضرت ابن عمر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دہ چند تناسب والی آیتِ کریمہ (۶۵) تو تمام صحابہ کرام کے حق میں نازل ہوئی تھی لہٰذا وہ عہدِ نبوی اور دورِ خلافتِ اسلامی کے تمام صحابہ کرام کے حق میں صحیح ثابت ہوتی ہے اور اسی سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اول آیتِ کریمہ منسوخ نہیں ہوئی تھی، کم از کم صحابہ کرام کی جماعتِ مقدسہ کی موجودگی میں یا جہادِ اسلامی میں ان کی شرکت کی صورت میں خواہ وہ کسی عہد میں رہی ہو۔ سوم اس روایت ابن عمرؓ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر پہلا تناسب صحابہ عظام کے سلسلہ میں تھا تو پہلے قلتِ تعدادِ مسلمین اور بعد میں کثرت کا اور ان دونوں سے بالترتیب پہلی اور دوسری آیتوں کے متعلق ہونے یا نازل ہونے کا نظریہ باطل ہو جاتا ہے کہ قلت میں بھی دہ چند کا اصول کارفرما تھا اور کثرتِ تعداد کی صورت میں بھی۔ چہارم یہ کہ دہ چند کا تناسب

نہ غزوۂ بدر کے لیے تھا اور نہ ابتدائی غزوات و سرایا کے لیے کہ تاریخ یہی کہتی ہے۔ پنجم یہ کہ علامہ ابن العربی اور علامہ قرطبی نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ مسلمان/صحابہ کرام کو یہ کبھی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ دہ چند سے مقابلہ کریں اور نہ انھوں نے ایسا کبھی کیا۔ ششم یہ کہ ان دونوں اماموں کی تصریح کی تصدیق تاریخی واقعات اور غزوات و سرایا میں طرفین کے عددی تناسب سے بھی ہوتی ہے۔ غزوۂ موتہ وغیرہ کے تعلق سے جن اعداد و شمار کا ذکر کیا جاتا ہے ان کے بارے میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے اور اگر کسی ایک غزوہ و سریہ میں ایسا ہو بھی گیا ہو تو وہ اصول نہیں بن سکتا۔ غزوات نبوی میں بالعموم ایک تین یا اس سے کچھ زیادہ کا تناسب رہا، بہر حال دہ چند سے مقابلہ کی بات کم از کم عہد نبوی میں نظر نہیں آئی۔ ہفتم یہ کہ شاہ عبد القادر دہلوی جیسے بزرگوں نے دو چند سے مقابلہ کے اصول کے تسلیم کرنے کے باوجود اس سے زیادہ دشمن سے مقابلہ کو مستحسن قرار دیا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ اول تناسب منسوخ نہ ہوا تھا اور نہ دوسرا ناسخ تھا۔

قرآنی نظریۂ قلت و کثرت

پھر عددی قلت و کثرت کا ایک اہم اصول قرآن مجید نے بیان کیا ہے جس کی طرف ان مفسرین کرام نے دھیان نہیں دیا جو قلت میں جوش عمل کی زیادتی اور کثرت میں اس کی کمی دیکھتے ہیں۔ اسی سورۂ انفال کی ایک آیت کریمہ ۶۰ ہے جو آیات زیر مطالعہ سے ذرا اوپر موجود ہے۔ اس میں ارشاد الٰہی ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ	اور تیار کرو ان کی لڑائی کے واسطے
مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ	جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے
تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ	گھوڑوں سے کہ اس سے دھاک پڑے
عَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ	اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں
لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ	پر اور دوسروں پر ان کے سوا جن کو تم نہیں
وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ	جانتے اللہ ان کو جانتا ہے اور جو کچھ تم
سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ	خرچ کرو گے اللہ کی راہ میں وہ پورا ملے گا
وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (۶۰)	تم کو اور تمہارا حق نہ رہ جائے گا۔ (ترجمہ شیخ الہند)

اس آیتِ کریمہ میں جو حکم واضح اور امرِ صریح دیا جا رہا ہے وہ صاف بتا رہا ہے کہ ہر طرح کی قوتِ حرب حاصل کرنے کا اصول مقرر کیا گیا تھا نہ صرف رسولِ اکرمؐ کے لیے بلکہ تمام صحابہ کرام اور بعد کے ادوار کے مسلمانوں کے لیے بھی اور اس میں عددی قوت بھی شامل تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ اس قوت کو بڑھانے کے لیے ہر طرح کے انفاق کا بھی حکم دیا جا رہا ہے اور اس پر دنیا و آخرت کی فوز و فلاح اور انعام کا وعدہ بھی کیا جا رہا ہے تمام مفسرین کرام خواہ ان کا تعلق ہمارے زیرِ بحث موضوع کے مطابق اول مکتبِ فکر سے ہو اس آیت کریمہ کی تشریح میں متفق ہیں کہ اس سے ہر طرح کی قوتِ حرب مراد ہے۔ بطورِ مثال مولانا امین احسن اصلاحی کے الفاظ پیش ہیں: "اس آیت میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ اپنی فوجی قوت نفری اعتبار سے بھی اور اسلحہ و اسبابِ جنگ کے اعتبار سے بھی زیادہ سے زیادہ بڑھائیں"[1]

احادیثِ نبوی اور اخبار و روایاتِ سیرت سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کے نزول کے بعد اپنی فوجی قوت ہر لحاظ سے بڑھانی شروع کر دی تھی اور اسی مستقل حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا کہ غزوۂ بدر ۲ھ میں تین سو تین سو مجاہدوں اور دو گھوڑوں سے بڑھ کر غزوۂ تبوک میں ان کی فوجی طاقت بالترتیب تیس ہزار مجاہدین اور دس ہزار گھوڑوں تک پہونچ گئی تھی۔

قرآن مجید کے اس واضح حکم، حدیث و سنت کے صریح عمل اور تاریخ و سیرت کے مسلمہ حقائق و شواہد کے بعد یہ کہنا کہ قلت میں جوشِ عمل زیادہ ہوتا ہے اور کثرت میں کم ہر لحاظ سے غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک حکم اس کے دوسرے حکم یا ارشاد کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ حدیث و سنت سے اس موقف کی تغلیط ہوتی ہے اور تاریخی حقائق کے بھی وہ بالکل خلاف ہے۔

صبر میں تخفیف کا نظریہ اور اس کی غلطی

اسی طرح کتاب و سنت اور تاریخ کے اس مسلمہ قانون حقیقت کے خلاف بعض متقدم و متاخر بزرگوں کا یہ قول بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ تخفیفِ تناسب کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسی قدر صبرِ مسلمانی میں کمی کر دی تھی جس قدر دشمن کی عددی طاقت و

---

[1] تدبر قرآن، سوم ص ۵۰۳

تناسب میں کمی کی گئی تھی۔ صبر کا تعلق مسلم قلت و کثرت سے ہرگز نہیں تھا ورنہ تخفیف ہی کے حکم سے۔ تخفیف کی وجہ مسلم ضعف اور کمزوری کی موجودگی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ خود حکم دے رہا ہے کہ ہر طرح کی فوجی طاقت بشمول عددی قوت بڑھاؤ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر پوری طرح عمل فرما رہے ہیں تو صبر میں تخفیف کیونکر کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں جیسا کہ علامہ محمود احمد شاکر نے اشارہ کیا ہے نصر الٰہی کی کمی کی جو بات کہی گئی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، بالکل صبر کے مانند وہ بھی ہے پھر تاریخی واقعات ثابت کرتے ہیں کہ قلت کے کثرت میں بدلنے کے بعد بھی اور تخفیف کے تناسب کے آنے کے بعد بھی نہ تو مسلم صبر میں کمی دیکھی گئی اور نہ ہی نصرتِ الٰہی میں کمی پائی گئی۔ عہدِ نبوی اور خلافتِ اسلامی بشمول اموی خلافت کے غزوات و مہمات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔

نظریاتِ مودودی و اصلاحی و عثمانی کا تضاد

مسلم قلت و کثرت کے حوالہ سے مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی نے دو بالکل متضاد نتیجے نکالے ہیں اول الذکر کا خیال ہے کہ ان آیاتِ کریمہ کے نزول کے وقت یعنی ۲ھ میں صحابۂ کرام کی اخلاقی تربیت مکمل نہیں اور ان کا شعور اور ان کی سمجھ بوجھ کا پیمانہ بلوغ کی حد کو نہیں پہونچا ہے.... کہ ان میں سے بہت سے لوگ ابھی تازہ تازہ ہی اسلام میں داخل ہوئے تھے تو دو چند کا مطالبہ کیا گیا اور جب وہ بعد میں پختگی کو پہونچ گئے تو ایک اور دس کی نسبت قائم ہو گئی۔" جبکہ مولانا اصلاحی کا خیال ہے کہ سابقون اولون جو بصیرت و عزیمت والے تھے کا بوجھ ان کے کندھوں سے اتار کر متاخر مسلمانوں پر ڈال دیا اور چونکہ وہ سابقون کے ہم پایا نہ تھے اس لیے ان کی ذمہ داری بھی کم رکھی۔ سچ یہ ہے کہ یہ دونوں نتیجے غلط ہیں۔ نہ سابقین اولین کی تربیت میں کمی تھی اور نہ ان میں تازہ نومسلم موجود تھے۔ پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ متاخرین سابقین کے مقابلے میں پختگی کو پہونچ گئے تھے اور زیادہ صاحب عزیمت، سوجھ بوجھ والے اور باشعور ہو گئے تھے۔ مولانا عثمانی کا یہ خیال کہ ابتدائی مسلمانوں میں بہت سے افراد بوڑھے اور کمزور ہو گئے اور تازہ واردانِ اسلام صاحبان بصیرت و عزیمت نہ تھے

تاریخی طور سے صحیح نہیں ہے اور نہ ہی ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ اپنی کثرت کے سبب ان میں توکل علی اللہ کی کمی آئی تھی۔ کیونکہ حقائق اس کے برعکس ہیں۔ دراصل ان تمام شارحین کے ذہن ودماغ پر قلت وکثرت کا مذکورہ بالا فلسفہ اور اس کے نتیجہ میں متقدین کی تشریحات حاوی ہیں۔ لہٰذا وہ ایک اصول کے دوسرے اصول سے بدلے جانے کے حق میں ہو گئے ہیں۔

الفاظ کے خبریہ اور ان کے معانی کے امر ہونے کا خیال: قتال کا حکم قرآنی

اسی طرح ان تمام مفسرین قائلین نسخ پر امام طبری کا بیان کردہ خیال حاوی ہے کہ ان دونوں آیات کریمہ میں الفاظ اگرچہ خبریہ ہیں مگر ان کے معانی امر وحکم کے ہیں یعنی اول آیت میں ان کو حکم دیا گیا کہ وہ دہ چند دشمن سے مقابلہ کریں اور دوسری میں اس کو بدل کر دو چند سے مقابلہ کر دیا گیا۔ حالانکہ ان آیاتِ کریمہ میں قتال کرنے کا حکم ہی نہیں ہے۔ جن مفسرین کرام نے قتال ومقابلہ کرنے کے بجائے فرار اختیار نہ کرنے کی تعبیر اختیار کی ہے ان کی تعبیر بھی صحیح نہیں ہے کہ ان آیاتِ کریمہ کا اس سے قطعی تعلق نہیں۔ قتال وعدم فرار کا حکم تو اسی سورہ کی آیت کریمہ ۱۵-۱۶ میں یہ دیا گیا ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ	اے ایمان والو! جب بھڑو تم کافروں
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ	سے میدان جنگ میں، تو مت پھیرو ان
الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ	سے پیٹھ اور جو کوئی ان سے پھیرے پیٹھ
دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ	اس دن مگر یہ کہ ہنر کرتا ہو لڑائی کا یا جا ملتا
مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ	ہو فوج میں سو وہ پھرا اللہ کا غضب
بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ	لے کر اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝	وہ کیا برا ٹھکانا ہے۔ (ترجمہ شیخ الہند)

جیسا کہ کلامِ الٰہی کے الفاظ بتاتے ہیں کہ بزدلی سے فرار ممنوع بلکہ باعث غضبِ الٰہی ہے۔ میدانِ جنگ میں دوران جہاد فرار کی ممانعت ہے لیکن اگر کسی جنگی چال کی وجہ سے میدان ومقابلہ سے گریز کیا جائے تو اس کی پوری اجازت ہے۔ ظاہر ہے کہ جنگی مصلحت یا حربی چال کی بنا پر گریز تو دہ چند کے مقابلہ میں بھی کیا جا سکتا ہے اور دو چند کے

مقابلے میں بھی۔ بلکہ اگر مسلم فوج اکثریت میں ہو مگر حالات و مصالح کی اجازت نہ ہو تو بھی جنگ سے پہلوتہی کی جا سکتی ہے۔ اصل جرم بزدلی اور دون ہمتی سے فرار اختیار کرنا ہے۔ لہٰذا دہ چند یا دو چند یا کسی تعداد دشمن کے ساتھ مقابلہ لازمی کیونکر ہو سکتا ہے؟ تقریباً تمام مفسرین و شارحین کی تفسیرات بھی اسی قسم کی ہیں چنانچہ امام طبری سے لے کر آج تک کے مفسرین نے یہی لکھا ہے۔

شاق ہونے کی توجیہ

رہا شاق ہونے کا مسئلہ تو اس کا تعلق بھی صبر کی مقدار، فوجیوں کے مزاج اور قوم کی نفسیات سے ہے۔ پھر قرآن مجید کی مختلف آیاتِ کریمہ واضح کرتی ہیں کہ جہاد و قتال کا حکم ہی شاق تھا، نہ صرف صحابہ کرام کے بعض طبقات و افراد پر، بلکہ اگلی امتوں میں سے بھی کچھ پر جیسا کہ حسب ذیل آیاتِ کریمہ میں صراحتِ الٰہی پائی جاتی ہے: بقرہ ۲۱۶، ۲۴۶ آلِ عمران ۱۲۱-۲۲، النساء ۷۷ وغیرہ اور اسی سورۂ انفال کی آیتِ کریمہ ۶ میں بعض "فریق مومنین" کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے کہ میدانِ جنگ میں جانا یا جہاد کے لیے نکلنا ان کو دیکھتے بھالتے موت کے منہ میں جانے کے مترادف لگتا تھا (کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون) لہٰذا محض شاق ہونے کی بنا پر نہ تو کوئی حکم منسوخ ہوتا ہے اور نہ تخفیف کے عمل سے گزرتا ہے اور آیات زیرِ مطالعہ میں تو شاق ہونے کا مسئلہ ہی نہیں۔ اگر دہ چند کا تناسب شاق ہے تو کیا ضمانت ہے کہ دو چند کا حکم نہ شاق ہوا ہوگا۔ جب کہ خود شہادت ربانی ہے کہ محض قتال کے لیے جانا بھی بعض پر شاق ہوا تھا۔ بالکل اسی طرح مومنین کی اکثریت کا معاملہ تھا کہ ان کو قتال و جہاد کا کوئی حکم شاق نہ تھا بلکہ وہ ہر حال میں جہاد کرنے کے لیے تیار تھے اور صرف تیار نہ تھے بلکہ جان دینے اور لینے پر آمادہ تھے ان کے شوقِ جہاد، اشتیاقِ قتال اور آرزوئے شہادت کے اخلاص اور کھرے ہونے کی تعریف تو اللہ تعالیٰ نے بھی کی ہے۔ (احزاب ۲۳-۲۲)

تخفیف و سہولت کا اصول قرآنی

اسی سے مربوط ایک مسئلہ تخفیفِ احکامِ اسلامی اور اس کی علت و جہ کا ہے کہ

دین آسان ہے اور وہ دفعِ ضرر اور جلب نفع لازمی کرتا ہے۔ متعدد آیاتِ کریمہ اور احادیث نبویہ بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ میں اپنے بندوں کی سہولت کا خیال فرماتا ہے اور دشواری میں آسانی پیدا فرماتا ہے۔ دوسرے مکتبِ فکر کے مفسرین نے پہلی آیت کے دوسری آیت سے منسوخ ہونے کی تردید اور اپنے موقف کی تائید میں تخفیف کے مختلف احکام سے بحث کی ہے۔ مثلاً امام اصفہانی اور امام رازی نے سورۂ بقرہ کی آیاتِ مقدسہ ۲۲۸ اور ۲۳۳ سے استشہاد کیا ہے ان دونوں آیات میں جو ارشاد ہے وہ حکم نہیں ہے۔ البتہ وہ "تکلیفِ حسن" ہے یعنی مائیں چاہیں تو اپنے بچوں کو دودھ پلائیں یا نہ پلائیں۔ پلائیں تو ضروری نہیں کہ پورے دو سال تک پلائیں وغیرہ ایسے کئی استثنا یا اجازتیں اس میں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح مطلقہ عورتوں کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اپنے شوہروں کے بارے میں تین طلاقوں تک انتظار کریں وہ ان کی مدت سے قبل بھی رجوع کر سکتی ہیں۔ البتہ دوسرے مرد سے نکاح کا معاملہ دوسرا ہے اسی طرح تخفیف نماز، تخفیفِ صیام اور بہت سے دوسرے احکام تخفیف کا معاملہ ہے۔ مثال کے طور پر مسافر کے لیے نماز میں قصر کے ذریعہ تخفیف کردی گئی ہے یا مریض، غیر مستطیع کے لیے صیام رمضان میں فدیہ کی تخفیف کا انتظام کیا گیا ہے۔ ان تمام صورتوں میں اول حکم منسوخ نہیں ہوتا۔

تخفیف تناسب کی صحیح وجہ: عزیمت و رخصت کی دو حالتیں

تخفیف کا یہ معاملہ دو مختلف حالتوں سے متعلق ہے: مقیم کے لیے کامل نماز اور مسافر کے لیے قصر نماز۔ بالکل اسی طرح دہ چند اور دو چند تناسب کا معاملہ دو مختلف حالتوں اور صورتوں میں ہوگا۔ جسے عزیمت اور رخصت کے دو ناموں سے بھی یاد کیا گیا ہے کہ کامل صبر والوں اور عزیمت والوں کے لیے دہ چند دشمن کا تناسب ہے اور کم صبر والوں اور رخصت والوں کے لیے دو چند کا۔ اس تخفیف کا تعلق زمانہ، نسل، طبقہ اور جماعت سے نہیں ہے بلکہ حالات اور اوصاف سے ہے۔

ان دونوں اماموں نے تخفیف کو بمعنی رخصت و اجازت بھی کلام الٰہی اور کلامِ عرب کے مطابق ہونا بیان کیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں سورۂ نساء ۲۸ نقل کی ہے

کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے تخفیف کا لفظ اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ ایک شخص جو آزاد عورتوں سے شادی کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا اس کو اجازت ہے کہ وہ باندیوں میں سے کسی سے نکاح کرلے۔ قرآن مجید کے اس استعمال نے تو اور بھی وسعت پیدا کردی ہے مگر یہاں بھی دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرنے کی اجازت دی گئی ہے جہاں کسی کے ناسخ ہونے اور کسی کے منسوخ ہونے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ ظاہر ہے کہ اگر استطاعت کی حالت پیدا ہو جائے تو وہی شخص آزاد عورت سے شادی کرسکتا ہے اور استطاعت نہ ہو تو باندی سے۔ جس طرح یہ دونوں آیتیں ایک دوسرے کی مقارن ہیں اسی طرح سورۂ انفال کی دونوں آیاتِ کریمہ ایک دوسرے کی مقارن ہیں یعنی استطاعت و قدرت کی صورت میں دہ چند کا تناسب اور عدمِ استطاعت کی حالت میں دوچند کا۔ پھر نسخ کا کہاں سوال پیدا ہوتا ہے؟ اسی کو دوسرے مفسرین کرام نے عزیمت و رخصت کی دو حالتیں قرار دیا ہے۔

حکمِ تحریض سے بقیہ آیات کا تعلق

سورۂ انفال کی زیرِ بحث آیاتِ کریمہ کی تفہیم و افہام اور ان کے معانی و مفاہیم کی تعیین و تشخیص میں بالعموم مکتبِ اول کے مفسرین کرام نے دوسری متعلقہ آیاتِ قرآنی کو سامنے نہیں رکھا ہے۔ زیادہ حیرت ان شارحینِ کرام پر ہوتی ہے جو قرآن مجید میں نظم کے قائل ہیں اور تفسیر قرآن بالقرآن کے دعوے دار پہلے آیتِ اولیٰ (۶۵) کا در ولبست ملاحظہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے رہا ہے کہ وہ مومنین کو قتال و جہاد پر آمادہ کریں۔ اس کے معًا بعد یہ ارشادِ الٰہی آتا ہے کہ اگر تم میں بیس صابر مجاہدین ہوں گے تو دو سو پر اور اگر سو (صابر مقاتلین) ہوں گے تو ایک ہزار پر غالب آئیں گے کیونکہ وہ (کافر) ایسی قوم ہیں جو سمجھ (فقہ) نہیں رکھتے۔ تحریض کے حکمِ الٰہی اور آیتِ کریمہ کے بقیہ حصہ میں کیا تعلق ہے؟ اس پر کسی مفسر گرامی نے غور نہیں کیا۔ اگر تدبر کی نگاہ ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ غلبۂ مسلم سے تعلق رکھنے والا پورا جزوِ آیتِ کریمہ تحریض کے حکم سے یا تحریض خاص سے وابستہ ہے جس

طرح سورۂ نساء ۸۴ میں تحریض کا حکم ہے: فقٰتل فی سبیل اللّٰہ لا تکلف الا نفسک وحرض المؤمنین۔ یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے قتال کا حکم ہوا اور اسی کے ساتھ تحریض کا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکمِ ربانی کے بعد ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں کو قتال پر ابھارا تھا اور اس امرِ الٰہی کی تعمیل میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی غلبۂ سلم والے حصۂ آیت میں ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی تحریض ہے کہ وہ اس خوشخبری، وعدہ بشارت، اصول اور قانونِ حق کے ذریعہ مسلمانوں کو قتال پر ابھار رہا ہے کہ اگر تم صبرِ کامل والے ہوئے اور تمہارا واسطہ ناسمجھ کافروں سے پڑا تو تم کو اپنے سے دس گنے دشمن پر غلبہ حاصل ہوگا۔ دوسری آیت بھی اسی تحریضِ الٰہی کا حصہ ہے کہ اگر تمہارا صبر کامل نہ ہوا کیونکہ ابھی تمہارے اندر (فوجی) کمزوری ہے تو اس صورتِ غیر مثالی میں بھی تمہارے ایمان و صبر کی بدولت تم کو اپنے سے دو گنے دشمن پر اذنِ الٰہی سے غلبہ ملے گا ہی کیونکہ اللہ تعالیٰ صابروں اور ثابت قدموں اور جمے رہنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس طرح ان دونوں آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنی تحریضِ ربانی کے ذریعہ مسلمان صابروں یا صابر مجاہدوں کو ان کے فوجی غلبہ کا یقین دلا رہا ہے کہ غلبہ و فتح تو بہر حال تمہارا مقدر اور تمہارا نصیبہ ہے: اگر صبرِ کامل والے ہو تو دس گنے دشمن پر اور اگر کمزوری سے دوچار ہو تو چونکہ اس صورت میں صبر کی مقدار میں کمی ہو جاتی ہے اس لیے دو گنے دشمن پر غالب ہی آجاؤ گے۔ قتال و جہاد پر تحریضِ الٰہی کی یہ مثال ہے جس میں فتح و نصرت کی بشارت شامل ہے کہ موخر الذکر کے بغیر آمادگی پیدا نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف سورتوں اور ان کی متعدد آیتوں میں مسلمانوں کو جہاد و قتال پر اسی طرح ابھارا ہے۔ کبھی فتح و نصرتِ الٰہی کے وعدے کے ساتھ، کبھی فرشتوں اور ملکوتی نفوس کی امداد کے ذریعہ اور کبھی جنت و انعاماتِ الٰہی سے سرفرازی کی خوشخبری کے وسیلہ سے۔ ان میں سے چند آیاتِ کریمہ کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ بات مدلل ہو سکے۔

غلبہ کی آیاتِ کریمہ

سب سے پہلے "غلبہ" سے متعلق آیاتِ کریمہ:

(الف) كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ط اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ٥ (مجادلہ: ۲۱)

اللہ لکھ چکا کہ میں زبر رہوں گا اور میرے رسول۔ بیشک اللہ زور آور ہے زبردست۔

(ب) وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (مائدہ: ۵۶)

اور جو کوئی رفاقت پکڑے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور ایمان والوں کی تو اللہ کی جماعت وہی ہوں گے غالب۔

(ج) اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ج وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ط وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران: ۱۶۰)

اگر اللہ تم کو مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا اور جو وہ تم کو چھوڑ دے گا، پھر کون ہے کہ تمہاری مدد کرے گا اس کے بعد۔ اور اللہ پر بھروسہ چاہیے مسلمانوں کو۔

(د) وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ (انفال: ۴۸)

اور جس وقت سنوارے لگا شیطان ان کی نظر میں ان کے اعمال اور بولا کوئی غالب نہ ہوگا تم پر آج کے دن، اور میں رفیق ہوں تمہارا.....

(س) قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ٥ (بقرہ: ۲۴۹)

بولے جن کو خیال تھا کہ ان کو ملنا ہے اللہ سے، بہت جگہ جماعت تھوڑی غالب ہوئی ہے، جماعت بہت پر، اللہ کے حکم سے اور اللہ ساتھ ہے ٹھہرنے والوں کے۔

(ص) الٓمّٓ ٥ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ٥ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ٥ (روم: ۱-۳)

(الم) دب گئے ہیں روم، لگتے ملک میں اور وہ اس دبنے پیچھے اب غالب ہوں گے.....

(ط) فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ

سو چاہیے لڑیں اللہ کی راہ میں، جو لوگ بیچتے ہیں دنیا کی زندگی آخرت پر اور جو کوئی لڑے اللہ کی راہ میں، پھر

أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ٥ (نساء: ۷۴)	مارا جاوے یا غالب ہووے، ہم دیں گے اس کو بڑا ثواب۔
(ع) ..... فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ٥ (مائدہ: ۲۳)	پھر جب تم اس میں پیٹھو (داخل ہو) تو تم غالب ہو اور اللہ پر بھروسہ کرو، اگر یقین رکھتے ہو۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی)

ان آیاتِ کریمہ میں غلبہ وفتح کا ذکر مختلف صیغوں اور زاویوں سے آیا ہے۔ پہلی دو آیاتِ کریمہ (الف، ب) میں یہ قانونِ حق بیان کیا گیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولوں کا حق ہے کہ وہ غالب ہوں اور یہ ان مٹ قانون ہے۔ یہی قانون حزب الٰہی کے لیے ہے جو رسولوں اور ان کے صادق وصابر پیروکاروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگلی دو آیتوں میں اس کی وضاحت ہے کہ نصرتِ الٰہی کا لازمی نتیجہ غلبہ ہے اور اس کے بغیر غلبہ کا امکان نہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف تو سب سے بڑے منکر حق شیطان کو بھی ہے۔ قلت وکثرت کے لحاظ سے غلبہ کا ذکر آیت بقرہ ۲۴۹ میں کیا گیا ہے جس میں یہ وضاحت ہے کہ بہت سی قلیل جماعتیں بڑے عددی گروہوں پر غالب آجاتی ہیں مگر اس کے لیے دو شرطیں ہیں: اوّل اذنِ الٰہی ہو اور دوم مجاہدین جماعت قلیلہ صابر ہوں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہی دونوں شرطیں سورۂ انفال کی ہماری زیرِ بحث آیات میں پائی جاتی ہیں اور وہاں قلت کے کثرت پر غلبہ کی بات کہی جا رہی ہے۔ یہ آیتِ کریمہ بنو اسرائیل کے لشکر حضرت طالوت اور ان کے حریف لشکرِ جالوت کے حوالے سے کہی گئی ہے جبکہ اگلی آیت سورۂ روم میں رومیوں کی غلبہ کی حقیقت اور خوشخبری کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی اذن ونصرتِ الٰہی سے مشروط ہے۔ سورۂ نساء کی آیت میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ مومن مجاہد کو غلبہ ملے یا شہادت وہ دونوں صورتوں میں عظیم ترین انعاماتِ الٰہی کے مستحق بنیں گے۔ آخری آیت کریمہ بنو اسرائیل میں حضرت موسیٰ اور ان کے پیروکاروں کے حوالے سے غلبہ کی حقیقت ظاہر کی گئی ہے اور ہماری بحث کے لیے بہت زیادہ اہم ہے۔ ان مجاہدین سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر تم شہر میں داخل ہو جاؤ گے تو تم غالب رہو گے بشرطیکہ تم اپنے دعوائے ایمان کے ساتھ توکل علی اللہ کا بھی پختہ ثبوت دو اور یہ ثبوت اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ تعمیل ارشادِ الٰہی

میں شہرِ موعود میں داخل ہو جائیں۔ اگرچہ یہاں شرطیہ جملہ تکنکی اعتبار سے نہیں ہے لیکن ہے وہ بھی ایک شرط کے ساتھ مشروط: یعنی اگر تم شہر میں داخل ہو گئے تو غالب ہو گے اور اگر بزدلی دکھاؤ گے اور حکمِ الٰہی کی تعمیل نہ کر کے شہر میں داخل نہ ہو گے تو غلبہ نہیں ملے گا اور درحقیقت ایسا ہی ہوا کہ وہ قتال کی یہ شرط پوری نہ کر سکے اور ان کو غلبہ نہیں ملا۔ جبکہ لشکرِ طالوت کو، رومیوں کو اور بدریوں کو غلبہ باوجود قلت کے ملا کہ ان کے ساتھ نصرتِ الٰہی تھی اور یہ نصرتِ الٰہی اذنِ الٰہی سے آئی تھی کہ مجاہدین مومنین صابر و ثابت قدم تھے اور غلبہ کی شرائط پوری کر رہے تھے۔

نصرت و اذن سے متعلق آیات کریمہ

اگرچہ قرآن مجید کی ان آیات کریمہ کے بعد جو غلبہ سے متعلق ہیں مزید آیات کریمہ کا جائزہ لینا زیادہ ضروری نہیں رہ جاتا تاہم بحث کو ہر لحاظ سے مکمل کرنے کی خاطر ایسی دوسری آیاتِ کریمہ کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جاتا ہے جو نصرتِ الٰہی اور اذنِ الٰہی سے متعلق ہیں۔ آل عمران ۱۲۳ بدر میں مسلمانوں کی فتح کو نصرتِ الٰہی سے جوڑنے کے علاوہ بہت اہم حقیقت یہ سامنے لاتی ہے کہ مسلمان کمزور (اذلۃ) تھے تاہم اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد و نصرت کی۔ حنین کے حوالے سے بہت سے مقامات (مواطن کثیرۃ) میں مدد عام کرنے کی حقیقت کے علاوہ غزوۂ متعلقہ میں خاص نصرتِ الٰہی کا ذکر ہے (توبہ ۲۵) متعدد آیاتِ کریمہ میں انبیاء کرام بالخصوص رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے نصرتِ الٰہی سے سرفراز ہونے کا ذکرِ خیر ہے (انبیاء ۷۷، صافات ۱۱۶، توبہ ۴۰، انفال ۶۲، ۷۴، حشر ۱۲، محمد ۷، غافر ۵۱، روم ۵، فتح ۳، محمد ۷، ملک ۲۰، حج ۴۰، غافر ۲۹، اعراف ۱۹۲، وغیرہ متعدد آیات کریمہ) سورۂ انفال ۹ میں اور بعض دوسری آیاتِ کریمہ میں فرشتوں کے ذریعہ مدد کرنے اور فوجی امداد فراہم کرنے کا ذکر ہے اور حدیث و سیرت کے واقعات و روایات سے جہاد میں ملائکہ کی باقاعدہ جنگ میں شرکت کا ذکر ملتا ہے۔ ان تمام آیاتِ کریمہ اور ان جیسی دوسری بہت سی آیات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت حق کے لیے ہوتی ہے، وہ مومنوں کی مدد ان کے صبر کے سبب کرتا ہے۔ بزدلوں کی مدد نہیں کرتا اور نہ ہی فراریوں کی نصرت کرتا ہے۔ جب اس کی

نصرت آتی ہے تو وہی اس کی اذن واجازت اور مرضی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس نصرت کے بعد مومن فریق اور صابر مجاہدین کا غلبہ لازمی اور ناگزیر ہے۔

صبر وقتال سے متعلق آیاتِ کریمہ

غلبہ، نصرت اور اذن الٰہی، کے بعد ایک جائزہ ان آیاتِ کریمہ کا بھی لے لینا چاہیے جو صبر کو قتال کے لیے اور قتال میں نصرتِ الٰہی کے لیے اور مسلم غلبہ کے لیے لازمی قرار دیتی ہیں۔ اگرچہ سورۂ انفال کی آیاتِ کریمہ سے بالخصوص اور بعض دوسری آیات مقدسہ سے صبر کا لزوم واضح ہوتا ہے تاہم اس مسئلہ کو قرآنِ کریم سے پوری طرح منقح کرنے کے لیے ضروری ہے پھر اس سے بعض دوسری اہم جہات بھی سامنے آئیں گی۔

بَلٰٓی اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا وَیَاۡتُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡرِھِمۡ ھٰذَا یُمۡدِدۡکُمۡ رَبُّکُمۡ بِخَمۡسَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ مُسَوِّمِیۡنَ ○ (آل عمران ۱۲۵)	اگر تم ٹھہرے رہو اور پرہیزگاری کرو اور وہ آویں تم پر اسی دم، تو مدد بھیجے تمہارا رب، پانچ ہزار فرشتے پلے ہوئے گھوڑوں پر۔
وَلَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡھَبَ رِیۡحُکُمۡ وَاصۡبِرُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ○ (انفال ۴۶)	اور آپس میں جھگڑو، پھر نامرد ہو جاؤ گے اور جاتی رہے گی تمہاری باؤ (ہوا) اور ٹھہرے رہو۔ اللہ ساتھ ہے ٹھہرنے والوں کے۔
قَالُوۡا رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ (البقرہ: ۲۵۰)	بولے: اے رب ہمارے! ڈال دے ہم میں جتنی مضبوطی ہے اور ٹھہرا ہمارے پاؤں اور مدد کر ہماری اس کافر قوم پر۔
وَالصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا ؕ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ○ (البقرہ: ۱۷۷)	... اور ٹھہرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور وقت لڑائی کے۔ وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی بچاؤ میں آئے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ (آل عمران ۱۴۲)	کیا تم کو خیال ہے کہ داخل ہو جاؤ گے جنت میں؟ اور ابھی معلوم نہیں کیے اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم کرے ثابت رہنے والے۔
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ ۝ (محمد:۳۱)	اور البتہ تم کو جانچیں گے تا معلوم کریں جو تم میں لڑائی والے ہیں اور ٹھہرنے والے اور تحقیق کریں تمہاری خبریں۔

(ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی)

قتال و جہاد کی لازمی شرط ہونے کی حیثیت سے یہ چند آیاتِ کریمہ پیش ہیں۔ پہلی دونوں آیتوں کا تعلق غزوۂ بدر سے ہے اور ان میں مسلم مجاہدین کو صبر و تقویٰ اور ثابت قدمی کا حکم دیا جا رہا ہے اور صبر کرنے والوں کے لیے ان کی نصرت کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔ تیسری آیتِ کریمہ مومنین لشکرِ جالوت کی دعا ہے جس میں صبر، ثبات قدمی اور اہلِ کفر کے مقابلہ میں نصرتِ الٰہی کی درخواست کی جا رہی ہے۔ باقی آیاتِ کریمہ میں قتال جہاد، جنگ و حرب میں صبر اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ ان تمام آیاتِ کریمہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جنگ اور جہاد اور قتال و حرب میں صبر و ثبات قدمی لازمی شے ہے۔ اسی سے فتح ملتی ہے، اسی سے نصرت ملتی ہے اور اسی سے غلبہ ملتا ہے۔ لہٰذا غلبہ کے لیے صبر لازمی شرط بن جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ صبر لازم ہے تو غلبہ ملزوم۔ یہاں اذنِ الٰہی بھی صبر کے ساتھ موجود و معہود ہے کہ وہ صبر کے باوجود غلبہ نہ عطا کرے ممکن نہیں۔ صبر کامل کا حقیقت میں ہونا ضروری ہے یعنی علمِ الٰہی میں، نہ کہ مجاہدین و مشاہدین کے خیال کی بنا پر۔

اِن شرطیہ سے متعلق آیاتِ کریمہ

سورۂ انفال کی زیرِ بحث آیاتِ کریمہ کو تقریباً تمام مفسرین مکتبِ اول نے خبریہ کہا ہے جن کے معانی امر و حکم کے ہیں۔ یہ تشریح امام طبری سے شروع ہوئی اور نسل در نسل اور صدی بہ صدی تمام مفسرین کرام کی تشریحات و تعبیرات میں شامل

ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ وہ مکتب دوم کے بعض مفسرین و شارحین کے ہاں بھی مل ہی جاتی ہے۔ حالانکہ ان سب اماماں فن اور عالمانِ علم کو بخوبی معلوم تھا کہ پہلے انشائی جملہ کے بعد "ان یکن" سے شروع ہونے والے دونوں آیاتِ کریمہ کے جملے انشائیہ ہیں: ایک شرط ہے اور ایک اس کا مشروط ہے اور ایسے جملوں میں حکم نہیں پایا جاتا۔ غالبًا وہ پہلے جملہ کے حکم سے متاثر ہو گئے یا امام طبری کی تقلید میں اس کے الفاظ کو خبریہ اور معانی کو انشائیہ یا حکمیہ بتاتے رہے۔ ان دونوں آیاتِ کریمہ میں غلبہ کو صبر کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے کہ اگر صبر و ثبات قدمی ہوگی تو غلبہ حاصل ہوگا۔ قرآن مجید اور کلام عرب میں بھی ایسا کوئی فقرہ جملہ یا کلمہ نہیں پایا جاتا جہاں "اِن" کے ساتھ جملہ شروع ہو اور وہ حکم و امر کا مفہوم رکھتا ہو۔ یہاں قرآن مجید سے چند مثالیں پیش ہیں:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا	اور اگر تم ٹھہرے رہو اور بچتے رہو،
یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا (آل عمران ۱۲۰)	کچھ نہ بگڑے گا تمہارا ان کے فریب سے

اس آیتِ کریمہ میں دو کاموں کا تعلق تیسرے عمل کے ساتھ مشروط ہے کہ اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو دشمنوں کا کوئی مکر و فریب تم کو ضرر نہ پہونچائے گا۔ اسی طرح اسی سورہ کی آیت ۱۲۵ ہے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ اس میں صبر و تقویٰ اور حاضری کے تین کاموں کو نصرتِ الٰہی سے مشروط کیا گیا ہے۔

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ	اگر اللہ تم کو مدد کرے گا تو کوئی تم پر
لَکُمْ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ	غالب نہ ہوگا، اور جو وہ تم کو چھوڑ دے گا
یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِہٖ....	پھر کون ہے کہ تمہاری مدد کرے گا اس
(آل عمران: ۱۶۰)	کے بعد.....
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَنْصُرُوا	اے ایمان والو! اگر تم مدد کرو گے
اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ	اللہ کی، تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔
(محمد ۷)	اور جمادے گا تمہارے پاؤں۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر)

ان تینوں آیات میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم ثابت رکھے گا اور اگر وہ چھوڑ دے گا تو کوئی ایسا نہیں ہے جو مدد کو پہونچے۔ اسی طرح سورۂ اسراء ۸ میں ہے "وان عدتم عدنا" یعنی

اگر تم سرکشی کروگے تو ہم تم کو سزا دیں گے۔ یہی بات سورۂ انفال ۱۹ میں کہی گئی ہے۔ "إن" شرطیہ سے شروع ہونے والے بہت سے جملے اور آیات قرآن مجید میں ہیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی حکم یا امر کا مفہوم نہیں۔ بلکہ ایک عمل کے نتیجہ میں دوسرے عمل کا وجود میں آنا بتایا گیا ہے۔ لہٰذا سورۂ انفال کی آیات ۶۵،۶۶ بھی شرطیہ ہیں یعنی اگر تم صبر کروگے اور ثابت قدم رہوگے تو تم غالب آجاؤگے۔

نسخ کا مفہوم

غلبۂ مسلم سے متعلق آیاتِ انفال کے اندر نسخ پائے جانے کا صریح اظہار بیشتر مفسرین قدیم وجدید کے ہاں ملتا ہے۔ متقدمین نے زیادہ تر آیتِ اولیٰ (۶۵) کو منسوخ کہا ہے لیکن ان میں سے بیشتر نے آیتِ ثانیہ (۶۶) کو ناسخ نہیں کہا ہے۔ بظاہر اسے لفظی احتیاط یا گریز کہا جا سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ متقدمین کے نزدیک نسخ کے وہ معانی نہیں تھے جو بعد کے فقہاء کے ہاں لیے جانے لگے۔ جس کے مطابق پہلا حکم بعد کے کسی حکم سے بایں طور منسوخ مانا جاتا ہے کہ اس کا اطلاق، نفاذ اور انطباق کالعدم ہو جاتا ہے۔ گویا کہ قانون یکسر بدل جاتا ہے اور مقدم کی جگہ مؤخر لے لیتا ہے۔ مفسرین کلام الٰہی اور ماہرینِ علوم قرآنی کے نزدیک نسخ کے مختلف معانی ہیں اور وہ فقہی نسخ نہیں ہے۔ اسی بنا پر ناسخ ومنسوخ کے سلسلہ میں دو مکاتب فکر پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ قرآن مجید میں نسخ کا سرے سے قائل نہیں ہے کہ موجودہ مصحف کی کوئی آیت اور کوئی حکم نہ تلاوت کے لحاظ سے منسوخ ہے اور نہ نفاذ و انطباق کے لحاظ سے۔ وہ نسخ کو بہت وسیع معانی اور وسیع ترجہات میں استعمال کرتے ہیں دوسرا طبقہ فقہی اصطلاح کے نسخ کا قائل ہے کہ ایک آیت دوسری آیت کے حکم کو منسوخ کر دیتی ہے اگرچہ اس کی تلاوت باقی رہتی ہے۔ پھر اس طبقہ میں بھی دو ذیلی اہلِ فکر ہیں۔ ایک کے ہاں قرآن مجید کی پانچ سو آیات کریمہ کا حکم منسوخ ہے جبکہ دوسرے نے ان کا دائرہ کم کرتے کرتے پانچ آیات تک سکیڑ دیا ہے۔

امام رازی کی تفسیر آیاتِ کریمہ میں امام اصفہانی کے متعلق یہ بات گذر چکی ہے کہ موخر الذکر چونکہ قرآن مجید میں نسخ کے سرے سے قائل نہ تھے لہٰذا انھوں نے دونوں

۲۰۱

کے احکام یا مدلولات باقی رہتے ہیں۔ قائلینِ نسخ کے ان پر اس زاویہ سے اعتراض کو بھی امام رازی نے نقل کیا ہے اور پھر اس کا کافی شافی جواب بھی دیا ہے اور پورے بحث و مباحثہ کے بعد وہ امام اصفہانی کے نقطۂ نظر سے نہ صرف مطمئن ہوئے بلکہ اسی کو صحیح مذہب و مسلک کہا ہے۔ امام اصفہانی پر ایک اعتراض قائلینِ نسخ اور بھی کر سکتے ہیں کہ وہ معتزلی تھے اور بالعموم معتزلہ نسخ قرآن کے قائل نہیں تھے لہٰذا ان کا نقطۂ نظر معتزلی اور ان کی تفسیر اعتزال ہے اس لیے اہلِ سنت کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ لیکن یہ اعتراض بھی حقائق و شواہد کے سامنے نہیں ٹھہر پایا کیونکہ امام اصفہانی کے بعد امام رازی نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے اور وہ معتزلی نہ تھے۔ ان کے بعد وہ امامانِ کرام ابن العربی اور قرطبی بھی اس کو نسخ نہیں مانتے اور بعد کے متعدد دوسرے مفسرینِ کرام بالخصوص مکتبِ دوم کے مفسرین بھی امام اصفہانی کے نقطۂ نظر سے اصولی طور سے متفق اور نسخ کے منکر تھے اور وہ بھی معتزلی تھے اور نہ ان پر اعتزال کا سایہ پڑا تھا لہٰذا یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے۔

نسخ کا مفہوم علامہ کشمیری

اہلِ سنت میں بھی بہت سے امامانِ عصر اور محدثانِ وقت اور فقیہانِ عالم ایسے ہیں جو قرآنِ کریم میں نسخ کے موجودہ عامل ہونے کے بالکل قائل نہیں۔ ان میں سے برِصغیر کے عظیم عالم و محدث و فقیہ علامہ انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء) کا نقطۂ نظر پیش کیا جا رہا ہے: فرماتے ہیں کہ "سلف میں نسخ کا اطلاق کثرت سے کیا گیا ہے اور ایسا اس بنا پر ہے کہ وہ مطلق حکم کو مقید بنانے، عام کو خاص کرنے اور ظاہر کی تاویل کرنے کا نام بھی نسخ رکھ دیتے ہیں، جبکہ اصولی علماء کے نزدیک نسخ کی قلت ان کے مقابلہ میں پائی جاتی ہے۔ لہٰذا میں اس نسخ کا قطعی منکر ہوں جو حکم کو قطعی ختم کر دینے کے معنی میں آتا ہے بایں طور کہ نہ اس کا نام باقی رہے، نہ جزئیات کے کسی جزئیہ میں اس کا اثر، جیسی کہ تفصیل صیام کی بحث میں گذر چکی ..." اسی بات کو علامہ مرحوم قرآن مجید کے صریح حوالہ کے ساتھ اس سے قبل یوں کہہ چکے ہیں: "جب میں نے ان کو اس مسلک پر گامزن پایا تو میں نے نسخ کا قطعی انکار کر دیا۔ میرا دعویٰ ہے کہ قرآن میں نسخ قطعاً وارد نہیں ہوا۔ میری

میری مراد اس نسخ سے ہے کہ جس میں آیتِ کریمہ اپنے تمام مشمولات میں منسوخ ہو جاتی ہے بایں طور کہ اس کے جزئیات میں سے کسی بھی جزئیہ میں اس پر عمل و رزی و عمل آوری باقی نہیں رہتی۔ میرے نزدیک یہ صورت حال غیر یقینی ہے۔ ایسی کوئی منسوخ آیت نہیں ہے جس کا مختلف وجوہ میں سے کسی نہ کسی وجہ میں اور مختلف جہات میں سے کسی نہ کسی جہت میں عمل باقی نہ ہو۔[۱]

غلبہ مسلم کے قرآنی اصول کی صحیح تعیین

گذشتہ مفصل بحث کے بعد قرآن مجید سے بالعموم اور سورۂ انفال کی آیاتِ کریمہ ۶۵-۶۶ سے بالخصوص فوجی مسلم غلبہ کا قرآنی اور اسلامی اصول متعین ہوتا ہے اور وہ دوسرے مکتبِ فکر کے مفسرینِ عظام کا بیان کردہ نقطۂ نظر ہے جو باختلافِ الفاظ و عبارات اپنے مفہوم و مدلول میں یکساں ہے۔ اس کے بنیادی نکات حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ اہلِ ایمان اگر صابرِ کامل اور کلی ثابت قدم ہوں اور ضعف و کمزوری سے بھی بری ہوں تو وہ چند دشمنِ نادان پر غالب ہوں گے۔ یہ اصلی اور معیاری اصول ہے جو حالتِ عزیمت میں کارگر و کارساز و کارفرما ہوتا ہے اور یہی اہلِ ایمان کا طرۂ امتیاز رہا ہے خواہ ان کا زمانہ اور علاقہ کوئی بھی رہا ہو۔ یہ ایک طرح سے ازلی اور ابدی قانون حق ہے۔

۲۔ اگر اہلِ ایمان میں صبرِ کامل اور پوری ثباتِ قدمی نہ ہو تو وہ ان میں کسی طرح کی فوجی کمزوری ہو تو وہ دُوچند دشمن پر ضرور بالضرور غالب ہوں گے یہ دوسرا قانونِ حق ہے جو حالتِ رخصت کا قانون ہے۔ یہ بھی زمانہ، علاقہ، امت وغیرہ کی بندشوں سے آزاد قانونِ تکوینی ہے جو تمام اہلِ ایمان کے حق میں مطلق ہے۔

عزیمت و رخصت کے دُو درجاتِ تفوق و تنزل کا بیان سورۂ انفال کی آیاتِ کریمہ میں آیا ہے اور ان کے اعتبار سے آیاتِ کریمہ کی تشریح یہ ہے۔

۱۔ آیتِ کریمہ ۶۵ اور آیتِ کریمہ ۶۶ میں غلبہ سے متعلق کوئی حکم دیا جا رہا ہے نہ مقابلہ و قتال کا۔ بلکہ آیتِ اولیٰ کے صرف پہلے حصہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] فیض الباری عن شرح البخاری، المجلس العلمی ڈابھیل، سورت ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء، جلد سوم ص ۱۵۹-۱۶۰ اور ص ۲۷۸-۲۷۷ (بالترتیب)

کو حکم وامرِ الٰہی عطا ہو رہا ہے کہ وہ مومنین کو جہاد پر آمادہ کریں۔ بقیہ آیات میں حکم نہیں ہے۔

۲۔ "فان یکن" سے شروع ہونے والی آیتِ کریمہ ۶۵ اور پوری آیتِ کریمہ ۶۶ دراصل تحریضِ الٰہی ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے مومنوں کو یہ بشارت دے رہا ہے کہ اگر تم ثابت قدم رہے اور کمزوری نہ دکھائی تو دہ چند دشمن پر اور بحالتِ حربی ضعف دوچند پر ضرور غالب رہو گے لہٰذا تم کو قتال وجہاد کے لیے ہر حال میں آمادہ اور تیار رہنا چاہیے۔

۳۔ ان دونوں آیاتِ کریمہ میں قتال کرنے کا حکم ضرور ہے مگر دشمن کی تعداد مقرر نہیں کہ حالت کے تحت قتال واجب، مستحب، ناجائز تک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مقابلہ کرنے اور فرار نہ ہونے کا مفہوم موجود نہیں ہے۔ البتہ تکوینی قانونِ الٰہی کا راز کھولا جا رہا ہے۔ جو بشارت ربانی بھی ہے اور وعدہ حق بھی۔

۴۔ قتال پر تحریضِ نبوی ہو یا تحریضِ الٰہی، ہر حال میں صبر وثبات قدم کا مطالبہ ہے۔ بحالت عزیمت کلی طور سے اور بحالتِ رخصت کچھ درجہ کم۔

۵۔ صبر وثبات قدمی سے عددی قوت، جنگی طاقت، فوجی آلات وتربیت، عسکری تنظیم غرضکہ ہر طرح کی فوجی صلاحیت بلکہ تفوق مراد ہے۔ ضعف سے ہر طرح کی فوجی کمزوری اور عسکری ناتوانی مراد ہے۔ البتہ عددی قوت کو اصل مدارِ فتح وغلبہ نہیں قرار دیا گیا جیسا کہ عربوں میں اور بعض دوسری اقوام میں خیال تھا۔ عددی تناسب کے دہ چند یا دوچند یا ان دونوں سے کم ہوتے پر بھی اہل ایمان کو ان کے صبر وثبات کے بدلے میں غلبہ و فتح کی بشارت دی گئی بلکہ اس کا وعدہ کیا گیا۔

۶۔ محض ایمان کافی نہیں فوجی غلبہ اور عسکری فتح کے لیے۔ صبر وثبات قدمی کو ایمان پر مستزاد شرط مقرر کیا گیا ہے۔

۷۔ غلبہ و فتح مسلم کے لیے ایک اور شرط "اذنِ الٰہی" کی مقرر کی گئی ہے۔ بالعموم یہ "اذنِ الٰہی" صبر وثبات کے ساتھ لازم وملزوم کی حیثیت رکھتا ہے کہ صبر کے ساتھ غلبہ و فتح لازمی ہے۔ لیکن کبھی مصلحتِ الٰہی کا تقاضا دوسرا ہو تو تمام شرائط صبر وثبات موجود ہونے اور تمام ضعف وکمزوری کی علامت کے مفقود ہونے کے باوجود غلبہ کا حصول غیر وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ یہ امکانی بھی ہے اور مصلحت آمیز بھی۔

۸۔ مصلحت آمیزی یہ ہے کہ صابر اہل ایمان اپنے اسباب ووسائل پر اعتماد کلی نہ کریں۔

بہر حال اللہ تعالیٰ پر توکل اور اعتماد رکھیں کہ مادی قوت کے ساتھ ساتھ عقیدہ و ایمان کی طاقت بھی غلبہ کے لیے لازمی ہے۔

۹۔ دہ چند دشمن پر مسلم غلبہ کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور شرط عائد کی ہے کہ دشمن فقہ رکھنے والے نہ ہوں۔ جبکہ دوچند دشمن پر مسلم غلبہ کی صورت میں یہ شرط نہیں رکھی گئی۔ بلکہ صرف اذنِ الٰہی کی شرط ہے۔ اسی کے ساتھ صبر کی شرط بھی ہے۔

۱۰۔ لہٰذا دہ چند دشمن پر مسلم غلبہ کے لیے یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی فوجی اور عسکری قوت پر بھی نظر رکھی جائے اور مسلمانوں کا صبر اسی کی مناسبت اور تناسب سے ہو، اس سے کم ہرگز نہ ہو۔

۱۱۔ پہلی آیت کریمہ میں کم از کم عددی مسلم قوت بیس مقرر کی گئی ہے۔ یہ محض دس یا دہائی اور صد/سیکڑہ کا دستورِ عرب نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے دس کی بجائے بیس[۲] صابرین کو رکھا ہے لہٰذا دہ چند غلبہ میں کم از کم مسلم فوج بیس صابر مجاہدوں پر مشتمل ہونی ضروری ہے۔ سو اور ہزار کی تعداد یا عددی نسبت زیادہ سے زیادہ تعداد کے مقرر کرنے کے مترادف نہیں ہے۔ وہ اوپر کی حدود میں سے صرف ایک حد ہے۔

۱۲۔ اسی طرح دوسری آیتِ کریمہ میں دوچند غلبہ اور مسلم کمزوری کی صورت میں مسلم مجاہدین کی تعداد کم از کم ایک سو ہونی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس سے کم عدد کو بالخصوص دہائی کے عدد کو نہیں بیان فرمایا گیا۔ ورنہ اول آیت کی مانند یہاں بھی بیس کے عدد ہی سے آغاز کیا جاتا۔ یا وہی نسبت عددی رکھی جاتی جو اول آیتِ کریمہ میں ہے۔

۱۳۔ غلبۂ مسلم کو محض ان دونوں آیاتِ کریمہ میں نہیں بیان کیا گیا۔ یہاں صرف معیاری اصلی اور عزیمت والی فتح اور دوسرے کم معیاری رخصت والے غلبہ کا بیان ہے۔ ورنہ غلبۂ مسلم تو اذنِ الٰہی سے اور صبر و عزیمت و ثبات قدمی کی صورت میں کسی عددی نسبت و تناسب کا پابند نہیں۔ جیسا کہ اسلامی تاریخ کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے۔